بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(گذشتہ سے پیوستہ)

تلافی مافات اور سچائی رفتارِ عمل کے لیے چند مزید توجہ طلب امور عرض ہیں۔

دعوت اور انقلابی تحریک برائے اقامتِ دین کا کام کرنے والے افراد اور گروہوں کے لیے ایک لازمی شرط استقامت ہے۔ استقامت کے معنی اتنے ہی نہیں کہ ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت (و آخرت) کے موقف سے آدمی کسی ظلم اور دباؤ اور لالچ کے باوجود نہ ہٹے۔ بلکہ وسیع تر مفہوم یہ ہے کہ نظامِ اسلام کے تمام اصول و مقاصد اور اخلاقی اقدار اور تہذیبی شعائر منہج انقلاب اسلامی

(بقیہ صفحہ ۲)

پاکستان پیچھے رہ گیا ہے، اِس فریضہ کی ادائی میں مجاہدینِ افغانستان آگے نکل جائیں۔ اَللّٰھُمَّ انصُرْھُمْ۔

ہوسکتا ہے کہ پاکستان سے لے کر ترکیہ تک ایک نیا سلسلۂ قوت نمودار ہو جائے۔

کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

اور اقبال کی یاد آئی تو غازی علم الدین شہید کی بھی یاد آئی، کیونکہ سلمان رشدی کی خرافات نے مسلمانوں کے جہانِ ایمان و جذبہ کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اقبالؒ، قائد اعظم، سید جمال الدین افغانی، غازی علم الدین شہید اور شہدائے مجاہدینِ افغانستان (برائے قیامِ حکومتِ اسلامی) سب پر خصوصی رحمتیں اور مغفرتیں فرمائے

کے ثابت و واضح ضوابط اور سماجی زندگی کے لیے اختیار کردہ معتدل و متوازن موقف کی دانتوں تک کا زور لگا کر حفاظت کی جائے۔ اگرچہ ہر طرف سے تاریکیوں کا سیلاب اُمڈا چلا آ رہا ہو، اگرچہ تعیشات و تفریحات اور اسبابِ تفاخر نے گھیرا ڈال رکھا ہو! اگرچہ معاشی و سماجی و ثقافتی ملوک (جس کی طنابیں دشمنِ اسلام تہذیب کے ہاتھوں میں ہیں) ہمیں ہر طرف سے بھینچ رہا ہو، اگرچہ نظامِ باطل کی قبر میں پڑے ہوئے ہر انسان کو حرام کی کھلی کھڑکی ہیں سے سرابِ گل و لالہ کے جلوے کھینچ رہے ہوں۔ ایک بار جو شخص سوچ سمجھ کر صبغۃ اللہ کو اختیار کر لے، پھر نہ وہ اس رنگ کو بدلے، نہ مدہم پڑنے دے۔ بڑے بڑے نیک لوگ صبغۃ اللہ کا تحفظ کرتے ہیں کوتاہ رہ جاتے ہیں۔

استقامت میں خلل اس وجہ سے بھی آتا ہے کہ بسا اوقات سالکِ جادۂ دعوتِ انقلاب یہ سمجھتا ہے کہ اُصول و مقاصد اور روایات و اقدار کے بنے بنائے سیدھے راستے سے تھوڑا ہٹ کر ایک گھاؤ کو طے کرنے کا پروگرام خود دعوت اور تحریک ہی کو کسی اور طریقے سے فائدہ پہنچائے گا۔ کارکن یہ سوچتے ہیں کہ ہم اہلِ خانہ، برادری، احباب اور مخالفین کے درمیان کسی ایک نقطے پر ڈٹ کر کھڑے ہونے اور اعتراضات و استہزا کا مقابلہ کرتے رہنے کے بجائے تھوڑا سا تغیر اپنے مقام اور رویے اور ہیئت میں کر لیں تو پھر شاید "فتوحات" کا سلسلہ بڑھ جائے گا۔

خدا کے پیغمبروں نے تو مخالفین کی طرف سے اس طرح کی سودا بازیوں کو جو بسا اوقات بڑی مخلصانہ اور معصومانہ دکھائی دیتی تھیں، وحیِ الٰہی کے ماتحت صاف صاف ٹھکرا دیا تھا۔ اس طرح کی سودا بازیوں کے خوگر صلاحیتِ انقلاب کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اسلام کوئی سیل ڈپو نہیں ہے کہ جب جو چیز چاہی خرید کر ڈال لی، جب جس چیز کو چاہا بیچ دیا۔ اور اس خرید و فروخت میں اچھائی کو بُرائی سے الگ چھانٹ پرکھ کر لینے دینے کے بجائے زیادہ تر سوداگری بڑی بُرائی اور چھوٹی بُرائی میں شروع کر دی۔ یہ فارمولا محض شاذ و نادر موقعوں پر اُصولی اُمور سے نیچے کے معاملات میں استعمال ہوتا ہے، یہ خود کوئی اُصول نہیں ہے کہ ہر جگہ کھل کر اس کا استعمال کیا جانے لگے۔ اس اُصول کو مستقل اوڑھ لینے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ کسی نہ کسی وقت ہر بُرائی اختیار کی جانے لگتی ہے جب کہ اس کے مقابل میں کوئی بڑی بُرائی موجود ہو۔ اور ہر چھوٹی بُرائی کے سامنے بڑی

بُرائی موجود ہوتی ہی ہے۔

استقامت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کسی اُصول یا نظریے یا تحریک یا جماعت کا تشخص جو اوّل روز طے ہوا تھا اور جس کی تشکیل اور جس کے اظہار اور جس کی حفاظت پر لمبی محنتیں صرف ہوتی ہیں، وہ کئی سال گذر جانے پر بھی جُوں کا تُوں رہے۔ اس کی جو قدر و قیمت اپنوں اور بیگانوں کی نگاہوں میں قرار پائی تھی وہ برقرار رہے۔ اُس نے جس چہرے کے ساتھ افقِ تاریخ پر پہلے دن جلوہ نمائی کی تھی، اس کے سارے خد و خال باقی رہیں اور کوئی جز مسخ نہ ہونے پائے۔ لوگ بعض چیز کو عام معاملات میں ناک بچانا کہتے ہیں، سیاسی اور تحریکی اور دعوتی دائروں میں اس کا برتر تصوّر "تشخص" یا "چہرے" کو بچانے کا ہے۔

خارج میں جو چیز چہرے کی تشکیل کرتی ہے، باطن میں وہی مزاج (صبغۃ اللہ) بناتی ہے۔ تحریکوں اور جماعتوں کی سلامتی اور برقراری اور ترقی اس میں ہے کہ وہ اپنے چہرے اور اپنے مزاج (تشخص) کو بچائیں اور بچائے رکھیں۔ ایمان سے لے کر تشخص و مزاج تک "استقامت" کے تقاضے پھیلے ہوئے ہیں۔

اب پڑھیے: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ...... الخ

رب کو رب کہہ دینا آسان، اس کی ہدایت کو قبول کر لینا مشکل، مگر جھٹ عزم کر لیا جائے تو یہ بھی ممکن! لیکن اس ہدایت کے ہر اُصول اور اس کی ہر قدر پر چند روز یا چند ماہ کے لیے نہیں ساری عُمر کے لیے جمے رہنا انتہائی کٹھن۔ اور جمے رہنے والوں کے لیے ماحول کے ظلم و جبر کے زیرِ اثر امتحان کی اُس منزل کو پار کر لینا اور بھی کپکپا دینے والا ہے جسے قرآن نے " حَتّٰی زُلْزِلُوْا " کے الفاظ سے ہماری نگاہِ تصور کے سامنے رکھا ہے۔ اس راستے میں جب کوئی مشکل موقع آئے تو آپ "چھوٹی بُرائی" کی پناہ گاہ تلاش کرنے لگیں تو پھر آخری مقامِ امتحان تک پہنچنے اور اور اس کی سعادتیں اور برکتیں سمیٹنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مولانا مودودیؒ نے کہا تھا کہ ہمیں ایسے کارکن چاہئیں جو نہ بکیں، نہ دبیں اور نہ جھکیں۔ اگر آپ معاشرے کی منڈیوں میں انسانوں کے بکنے کے لطیف طریقے مشاہدہ کریں اور اسی طرح دبنے اور جھکنے کے نرالے ڈھنگ دیکھیں تو آپ سوچ میں پڑ جائیں۔ مثلاً ایک طرف ایک کاروباری مفاد

ہے اور دوسری طرف تحریک کی خدمت، آپ گذر بسر کی معاش سے اوپر جانے کے لیے اپنے اصولوں اور اخلاقیات کی نئی تعبیریں اختیار کر لیتے ہیں۔ یا ماحول کے سامنے دبنے اور رواجوں کے سامنے جھکنے کے لیے یہ دلیل پیدا کر لیتے ہیں کہ بڑے معاشرے کے مجموعی حالات سے تو ہم الگ نہیں ہو سکتے تو پھر کہاں رہی وہ بات کہ "نہ بکیں، نہ دبیں اور نہ جھکیں"۔

یارانِ طریق! قرآن کا یہ ایک اصطلاحی اور انقلابی لفظ استقامت بڑی ہی بھاری ذمہ داریاں آپ پر لادتا ہے۔ کیا آپ نے ان ذمہ داریوں کو سمجھا؟ اور کیا ان کو پورا کرنے پر تیار ہیں؟

یہ بات بھی دعوت ہی کے تحت آتی ہے کہ ہمیں ہر ممکن بصیرت مندانہ کوشش کر کے علماء مشائخ اور دینی جماعتوں اور ان کے مدرسوں اور اداروں اور جرائد و مطبوعات کو اس مقصد کے لیے متحد کر دینا چاہیے کہ وہ الحاد، دہریت اور لادینیت اور منکرات و فواحش کے خلاف اپنے اپنے طریقوں سے جہاد کریں اور دینِ برحق کے علو کے لیے خون پسینہ ایک کر دیں گے۔
موجودہ حالت بڑی افسوس ناک ہے کہ دینی گروہ اور علماء و مشائخ اور اسلامی حلقوں سے نسبت رکھنے والی شخصیتیں الگ الگ کمپ لگا کر افکار و نظریات پیش کر رہے ہیں اور ہر کوئی اپنی روش جداگانہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک آواز آئے گی کہ فلاں چیز اسلام میں ضروری ہے۔ دوسری طرف سے صدا بلند ہوگی کہ وہ ہرگز ضروری نہیں ہے۔ ایک کہے گا کہ آٹھویں ترمیم کو اڑا دینا چاہیے، دوسرا کہے گا بالکل برقرار رکھنا چاہیے، تیسری آواز یہ بھی؟ آئے گی کہ اس کے تمام اجزا کو الگ الگ لے کے دیکھنا چاہیے کہ کس کو ختم کرنا ضروری ہے۔ عورت کی سربراہی کا مسئلہ ہو، جمہوریت پر بحث چھڑے، حدود کے مقدمات میں عورت کی شہادت کی نزاع ہو یا سود کا مسئلہ، بلکہ شب برات اور سنت اور ختنے تک پر بحثیں چھڑ جائیں گی۔ یعنی بابل والی صورت۔ پھر سیاست میں آئیں گے تو کوئی کسی ایک پارٹی کے ساتھ، کوئی دوسری جماعت کے ہمراہ۔ کوئی سب سے الگ تھلگ، کوئی تمام دینی اور سیاسی عناصر کے خلاف۔ اس چیز نے نہ صرف دینی حلقوں کے وقار و وقعت کو کم کیا ہے بلکہ خود دینِ اسلام کے خلاف بدظنی پھیلانے والوں کے ہاتھ مضبوط کیے ہیں۔ اب حد یہ ہے

کہ دینی شخصیتوں اور ان کے سیاسی دھڑوں کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ انہیں کوئی بھی ساتھ لے سکتا ہے، نیز بالعموم ان کے خلاف تضحیک و استہزا کے ہتھیار استعمال کیے جاتے ہیں۔

ذرا بغور ملاحظہ فرمایئے کہ ہمارے معزز و مکرم دینی اصحاب کے جرائد میں کس طرح بحثوں اور کج بحثیوں کے چکر چلتے ہیں۔ مثلاً میں نے ایک ہی فرقے کے اصحاب کے دو گروہوں کی بحثیں پڑھیں، ایک دوسرے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ "او مولوی صاحب! کچھ خدا کا خوف کرو، کیوں مسئلے گھڑتے ہوتے ہو"۔ دوسرا کہتا ہے کہ "آپ جیسے لوگ سراپا جہالت ہو کر دین کے نام سے جھوٹ بولتے ہیں"۔ (پرانی یادداشت میں ترتیبِ الفاظ شاید کچھ مختلف ہو گئی ہو)

سچائی کو مسخ کرنے کی صورتیں، سچائی سے غلط نتائج نکالنے کے اسلوب اور دین کی حقیقتوں میں سے کسی بھی اکائی کے دو ٹکڑے کر کے ان کو لڑا دینا، اپنے قدامت پسندانہ ذوق کے تحجر کی وجہ سے ۱۵ ویں صدی ہجری کے مسائل کو پہلی صدی ہجری کی فضا میں رکھ کر سوچنا، یا اپنے بوسیدہ تشخص سے پیدا ہونے والے احساسِ کمتری کے ردعمل میں جابت طرازوں کو مات کر دینے کے شوق میں اُن سے بڑھ بڑھ کر قدم مارنا، یہ بڑے دردناک احوال ہیں۔ اپنے بزرگوں کی باتیں ہیں اور ان باتوں کو چھیڑ کر دل بہت رنجیدہ اور شرمسار ہوتا ہے۔ مگر صلاح و فلاح کے لیے بھی تو بے لاگ تجزیۂ احوال کی ضرورت ہے۔

نہایت اندوہگیں صورتِ حالات کا ایک پہلو ایسا ہے جس کا تعلق ہم سے بھی جا جڑتا ہے۔ یعنی ہم سے اختلاف کر کے جانے والے اصحاب میں سے کچھ تو خاموشی و خلوت کے دائرے میں حسبِ منشا کوئی کام کرتے ہوں گے، کچھ وہ ہیں جنھوں نے ہمیں بھول بھلا کر اپنے ذوق کے مطابق کوئی دینی مشغلہ اختیار کر لیا۔ پھر کچھ وہ تھے جو ایک ہی مرتبہ جاتے جاتے لات مار گئے اور اسی میں ان کا نشہ پورا ہو گیا۔ مگر کچھ اصحاب وہ بھی ہیں جو ہمارے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کمپ لگائے ہوئے ہیں۔ ان کے نظریات بھی اسلامی ہیں، مگر اختلافی نظریات میں کہیں کم اور کہیں بہ زور ایک انتقامی زہر بھی شامل ہے۔ یہ زہر انہیں مجبور کرتا ہے کہ دین کی خدمت کرتے کرتے ہمیں بھی ڈنک ضرور لگائیں۔ کوئی قرآن کی تفسیر کرتے کرتے اور کوئی حدیث کی تشریح سامنے لاتے ہوئے اور کوئی فقہی مباحث چھیڑتے ہوئے اس فریضہ سے غافل نہیں ہوتا کہ اپنی علمی یا متقیانہ گل پاشیوں کے

سامنے تھوڑی سی گلو رخ اندازی سے ہمیں مشرف کرتا رہے ۔ اوران سب کے لیے حلقۂ مخاطب نہ غیر مسلم ہیں، نہ معاشرے کے بگڑے ہوئے اکابر و عوام، بلکہ اُن کی شکار گاہ ہمارے ہی ہم خیال اور ہم قدم نوجوان ہیں ۔ یعنی کیا ہی شاندار تحریکِ افتراق ہے جو چل رہی ہے ۔ سب کے "اڈے" اور "اکھاڑے" ہیں جہاں سے دوسروں کو چیلنج دیئے جاتے رہتے ہیں ۔ ایک دوسرے کو اُکسانا، چٹکیاں بھرنا، مذاق اُڑانا، فتوے چسپاں کرنا، لوگوں کے ایمانوں کی پیمائش کرنا، نیتوں کی جھلکیاں کاغذ پر لے آنا، کیا ہی شاندار کمالات ہیں ۔ سب کے اپنے اپنے جریدے اور رسالے ہیں، جن میں کہیں بہت ہی شائستہ اور کہیں بہت گھٹیا لپاڈگی کا سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ پھر کتابوں کی کتابیں فتنۂ تحزّب کے تحت چھپتی ہیں ۔ جن کے اوراق مسلمانوں کے درمیان دیواریں کھڑی کر دیتے ہیں ۔ ان کتابوں اور رسالوں کے غیر صحت مندانہ پہلو کی وجہ سے عوام کے اخلاق و کردار میں کوئی بہتری پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اُلٹا پستی آتی ہے ۔ ہر کسی کا دعویٰ کہ ہم سچے ہیں، نیک صرف ہم ہیں اور دین کی صحیح نمائندگی کرنے کا واحد اجارہ ہمارے پاس ہے ۔

مسجدوں کے وعظ سنیئے، جمعوں کے خطبے سُنیے، میں نے تو شاذ و نادر ہی کبھی کسی جگہ کام کی کوئی بات سُنی، ورنہ روز ِازل کے قضیئے، نُور کی ماہیت اور تخلیق کے میدان اور بزرگوں کی کرامات کی کہانیاں سُنی ہیں ۔ چاروں طرف جو اخلاقی خرابیاں اور حرام کمائیاں اور منکرات و فواحش کا طوفان پھیلا ہوا ہے، اس کی طرف طنز و تضحیک کے بجائے دردمندی سے کسی واعظ و خطیب نے بھرپور اور مؤثر توجہ ہی نہیں دلائی ۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر ہمارے علماء و مشائخ اور دینی ادارے اور جماعتیں اپنی روش کو بہتر بنالیں اور لادینیت[1] کے خلاف محاذ کی مضبوطی کا اہتمام کریں، نیز ایک دوسرے کے عمومی اختلافات کی بحثا بحثی اور باہمی نشتر زنی اور ناوک اندازی کے مشاغل کو ترک کر کے اپنی ایک مشترک کونسل بنالیں جو اہم دینی و ملی مسائل میں ٹھکی ہوئی فیصلہ کُن رائے دے سکے اور افراد اور جماعتوں کے درمیان ہونے والی نزاعات کو بھی حل کر سکے تو پھر یہاں ایک ایسی مؤثر قوت

---

[1] اس گفتگو میں قادیانی، منکرینِ حدیث اور دوسرے مخالفِ اسلام عناصر پیشِ نظر ہیں ۔

پیدا ہوسکتی ہے کہ لادینیت کو نہ پروپیگنڈے کے دائرے میں، نہ انتخابات میں اور نہ پارلیمان میں سر اٹھانے کی جرأت ہوسکتی ہے۔ بلکہ ان شاء اللہ علما کی متحدہ قوت کا اٹھایا ہوا ہر مطالبہ منتخب ممبران اور حکمرانوں کو ماننا پڑے گا۔

اگر مثبت طور پر اتحاد و اتفاق ایک ہی مرحلے میں حاصل نہ ہوسکے تو کم از کم "عدمِ محاربت" کے منفی سمجھوتے پر سب کو جمع کر لیا جائے۔ ضروری نکات یہ ہیں:

۱۔ علما کی ایک نمائندہ کونسل عالمی اور ملکی حالات پر اس پہلو سے نظر رکھے کہ لادینیت کی علمبردار اور منکرات و فواحش کو فروغ دینے والی قوتیں، نیز مسلمانوں کو ان کے اپنے آزاد ملکوں میں فکری، تعلیمی، ثقافتی، معاشی، ڈپلومیٹک اور سازشی حرکات کیا کیا ہیں اور ان کے خلاف کس طرح مزاحمت کی جائے۔

۲۔ یہ اصول تسلیم کرتے ہوئے کہ ہر کسی کو اپنے نظریاتی اور فقہی خطوط پر چلنے کا حق ہے، ایک واضح اعلان تمام فرقوں کے علما نشر کریں کہ ہم باوجود اپنے اختلافات کے کفر و الحاد اور منکرات و فواحش کے خلاف متحد ہیں۔

۳۔ سب کا متفقہ نصب العین خدا کی حاکمیت کے تحت قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی اور اسلامی نظامِ خدمت و عدل کا نفاذ ہے۔

۴۔ بڑے بڑے دینی و شرعی مسائل جب اٹھیں تو بعض صورتوں میں علما کی مقامی کونسلوں کو اور اہم صورتوں میں مرکزی کونسل کو ایک ہی نقطۂ نظر دلائل سے متعین کر دینا چاہیے۔ اختلافی بحثیں کونسلوں کے اندر رہیں۔

مولانا مودودیؒ کے پورے دور میں اس مقصد کے لیے مساعی جاری رہیں جن کے نتیجے میں ۹ نکاتی مطالبے کی منظوری، بنیادی دستوری اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کا استرداد، ۲۲ دستوری نکات پر کامیاب اتحاد اور بعد ازاں عائلی قوانین اور رویتِ ہلال وغیرہ کے مسائل پر مضبوط موقف، وغیرہ نتائج حاصل ہوئے۔ بعد میں بھی اگرچہ یہ مساعی جاری رہیں اور اب بھی مرکز کی طرف سے ہوتی رہتی ہیں، مگر ضرورت ایک مضبوط منصوبہ بندی کی ہے کہ کیسے لوگ ان دائروں میں کن کن اسالیب سے کام کریں۔ کام کیا، ایک مہم چلا دیں۔

کوئی ذرا سا فتنہ اُٹھے یا دین کے کسی ادنیٰ ترین تقاضے کا معاملہ سامنے آئے ، ہماری دعوتی مشینری کو ایک ایک مسجد تک اس کے متعلق ضروری مواد (یا پس منظر وغیرہ) کو پہنچا دینا چاہیے اور پھر علماء سے بات چیت اور استفادے کے لیے ہر جگہ ٹیمیں نکل کھڑی ہوں ۔

خیال رہے کہ علماء بڑی مشکل چیز ہیں ۔ ان کا بہت ادب کیجیے ، ان کی زیادتیاں صبر سے برداشت کیجیے ، ان کے معاملے میں سخت محتاط رہیے اور اُن سے ایک مؤدب شاگرد اور سائل کی طرح بات کیجیے ۔ ہمیشہ یہ ملحوظ رکھیے کہ اقامتِ دین کا کام کرنے والوں کے لیے یہ قوت بہت ہی بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ لیکن اگر یہ پراگندہ رہے تو ہمارے لیے نقصانات بھی بہت ہیں ۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ کام اگر ہو جائے تو اس ملک میں ایک بڑا انقلابی قدم ہوگا ۔

آج اگر ایسا ہوتا کہ جو دینی قوتیں اور گروہ پارلیمانی سیاست میں آئے ہیں وہ سب کے سب ایک صفِ بے رخنہ میں ہوتے تو وہ ساری ناگوار صورتیں واقع نہ ہو سکتیں جن کی تلخی کو ہم بھگت رہے ہیں ، یا جو طرح طرح کی متضاد بحثیں چھڑی ہوئی ہیں ۔

سیاسی سرگرمی اور انتخابی جدوجہد بھی ایک دائرۂ دعوت ہے ، نیز ذریعۂ اثر اندازی ۔ احتیاط صرف یہ لازم ہے کہ سیاسی کام کرتے ہوئے بھی دینی رنگ برقرار رہنا چاہیے ، اور دین سے جُدا سیاست کا کوئی تصور کارفرما نہیں ہونا چاہیے ۔ دین کو اوّلیت حاصل رہے گی تو دینی سیاست نمودار ہوگی اور سیاست غالب رہے گی تو سیاسی دینداری بن جائے گی ۔ دین و سیاست کو ایک اکائی کے دو پہلو ہونا چاہیے ، جیسے دین اور تعلیم ، یا دین اور معیشت وغیرہ ۔

دین کے اخلاقی اقدار و شعار جس طرح تمام زندگی میں غالب رہنے چاہئیں ، اُسی طرح سیاسی (وانتخابی) سرگرمیوں میں غالب رہنے چاہئیں ۔

دوٹروں کا ہجوم جمع کرنا اور ارکان و متفقین بنانا دو الگ الگ کام ہیں ۔ انتخابی نعروں پہ جمع ہونے والے دوٹروں کو اُس طرح کا کارکن نہ سمجھا جائے جن پر ہمارے لوگ بالمشافہ

طریقوں سے لمبی محنت کرتے ہیں۔ ووٹروں کو جمع کرنے کے تصور کے دباؤ سے ممبرشپ وغیرہ کے معیارات کو گھٹایا نہ جائے اور معیار پر مقدار (تعداد) کو ہرگز ترجیح نہ دی جائے، ورنہ جماعت کی بنیادیں جن تصورات پر رکھی گئی ہیں اور دستور کے جو تقاضے سامنے ہیں، ان سب کو نقصان پہنچے گا۔ یہاں تک کہ جماعت کے تعبیدی و اخلاقی تشخص، اس کے تحریکی چہرے اور اس کے برسوں میں بننے والے مزاج کا تحفظ ممکن نہیں رہے گا۔

سیاست میں اگر صرف "جمہوریت" کا عنوان لے کے چلا جائے تو اس سے لازماً مراد مغرب کی لادین اور عوام پرست حکومت ہوتی ہے جس کے لیے ہونے والے انتخابات میں دینی مقاصد اور اخلاقی اقدار کا کوئی لحاظ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی جمہوریت جب بھی نمودار ہوگی تو ایسے ایسے قوانین اور پالیسیاں اور اقدامات اور کارروائیاں سامنے آئیں گی کہ محبانِ دین کے سر جھکا جائیں گے۔ اور ایسا تجربہ آج ہو رہا ہے۔

مولانا مودودیؒ نے لادین مغربی جمہوریت پر بھرپور ضربیں لگا کہ اسلامی جمہوریت (خلافت وشورائیت) کا کام کرنے کے لیے جو خطوطِ کار مرحلہ بہ مرحلہ تجویز کیے، ان سے حسبِ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ ہمیں ساری گفتگو اسلامی جمہوریت کے لیے کرنی چاہیے۔

۲۔ کوشش کرنی چاہیے کہ مروجہ جمہوریت میں ایسی تبدیلیاں ہو جائیں کہ گاڑی اسلامی جمہوریت کی راہ پر چلنے لگے۔ اِس سلسلے میں ہر موقف اور موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، ساری تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں۔ اور متحدہ ومشترکہ مطالبے سامنے لانے چاہئیں۔

۳۔ ضروری ہے کہ انتخابی دور میں ووٹروں کے سامنے یہ اصول ضرور رکھے جائیں کہ انقلابِ قیادت سے کیا مراد ہے اور سامنے آنے والے امیدواروں میں کم سے کم کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اِس دعوت کو بار بار معاشرے کے مختلف حصوں میں پھیلایا جاتا رہے۔ اگر عین انتخابی بخار کے زمانے میں یہ کام نہ ہو سکے تو اس سے ایک ماہ قبل یا اور بھی پہلے کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ فی نفسہٖ دستور اور نظامِ انتخاب میں تبدیلیاں واقع ہونی چاہئیں۔ اِس کے لیے

قرار دادِ مقاصد پاس کرائی گئی اور بعد میں بھی اُمیدواروں کے اوصاف دستوری دفعات میں شامل کیے گئے۔ اگرچہ عملاً ان کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

۵۔ اگر دینی قوتوں میں قابلِ اعتماد اتحاد پیدا نہ ہوسکے تو اضطراراً کسی دوسری قوت سے اتحاد کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس صورت میں اول تو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ بدنام قوت نہ ہو، ناقابلِ اعتبار نہ ہو اور مخالفِ دین نہ ہو۔ دوسری بات یہ ضروری ہے کہ شرائطِ اتحاد میں دو ایک واضح نکات ایسے شامل ہونے چاہئیں جو نفاذِ اسلام سے متعلق عملی تقاضے سامنے لائیں تیسرے یہ لازم ہے کہ مشترک نمائندے کھڑے کرنے کی صورت میں یہ شرط پہلے سے طے کی جائے کہ بہت ہی بدنام قسم کے کج اخلاق لوگوں کو دوسرے شرکائے اتحاد ٹکٹ نہ دیں گے، اور اگر دیں تو ایسے خاص حلقوں میں ہمارے ووٹروں سے ووٹ کا مطالبہ نہ کریں۔

۶۔ تبدیلیٔ جمہوریت اور اصلاحِ انتخابات کے لیے ایک بڑا مؤثر ذریعہ تناسب نمائندگی کا طریقہ ہے۔ مگر اس طریقے کو منوانے کے لیے کبھی کبھار کسی بیان یا تقریر کا ہوجانا کافی نہیں۔ اس کام کو اگر حتمی طور پر کرنا ہے تو ایک تحقیقی کتاب انگریزی میں اور ایک اردو میں خوب پھیلائی جائے، پھر سیمینار منعقد کرائے جائیں، اخبارات کے فورم میں مباحثے ہوں، بعض اہم جرائد خاص نمبر نکالیں یا بڑے اخبار خصوصی ضمیمے شائع کریں۔ ہوسکے تو دو ایک بار تناسب نمائندگی کا ہفتہ منانے کی صورت اختیار کی جائے۔

اس کام کے لیے کسی خاص کونسل یا کمیٹی کو پورا نقشہ تیار کرنا چاہیے۔ یہ کوئی سرسری کام نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود منتخب ہونے والے ارکان کے لیے بھی اور وزراء کے لیے بھی دینی و اخلاقی معیارات ہونے چاہئیں۔

ہمارے منتخب دوستوں کا کام یہی نہیں کہ وہ اجلاسوں میں بیٹھیں اور رواینی پارٹ ادا کرتے رہیں۔ بلکہ انہیں ایک انقلابی جماعت کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے ہر مسئلے میں اپنے خاص اندازِ گفتگو سے اسلامی انقلاب کے لیے کوئی لطیفہ اور خوبصورت بات ہمیشہ اٹھائے رہنا چاہیے۔ نیز ان کو تمام ممبران، وزراء، اسپیکر، اپوزیشن کے ساتھیوں اور افسرانِ حکومت (باقی بر صفحہ ۴۹)

(بقیہ اشارات) (ریورو کرلیسی) سے مسلسل ملاقاتیں کرکر کے ایک، تو حکومتی امور اور سیاسی ہیر پھیر کو سمجھنا چاہیے، دوسرے ان تک کسی نہ کسی شکل میں دین کا پیغام بھی پہنچانا چاہیے، بلکہ پہنچاتے رہنا چاہیے۔ ان کے ساتھ شعبۂ پارلیمانی امور کو یہ ضروری تعاون بہم پہنچانا چاہیے کہ جو بھی مسائل ایوان میں آئیں یا آنے والے ہوں ان پر حقائق و واقعات کے پہلو سے بھی اور اسلامی رہنمائی کے پہلو سے بھی اور ضرورت ہو تو بیرونی نظائر کے لحاظ سے بھی فوری طور پر مختصر لٹریچر لیف لیٹ وغیرہ تیار کر کے پھیلا دینے چاہئیں۔ بیشتر لوگ خالی الذہن ہوتے ہیں - اور جب ان کو مواد ملتا ہے تو اس کو سامانِ تقویت سمجھتے ہیں اور کچھ نہ کچھ اثر نظریاتی طور پر بھی لیتے ہیں، کیونکہ ان کی اکثریت مسلمانوں ہی کی ہے۔

اچھا پارلیمنٹیرین وہ ہے کہ سیاسیات، دستوری مسائل، ایوان کے ضابطۂ کارروائی اور ملکی اور غیر ملکی پارلیمنٹوں کی رپورٹوں کا گہرا مطالعہ رکھنے کے ساتھ اپنے ملک کے ہر شعبے کے ضروری اعداد و شمار اور سرکاری شائع شدہ مواد پر نظر رکھے۔

اب ذرا پیچھے پلٹ کر یہ بات تازہ کر دی جائے کہ انتخابات جیتنے کے لیے عوام کی ہر پسندیدہ چیز کو اختیار کر لینا، یا حریفانِ مقابل جو جو حرکتیں اور ہتھکنڈے اختیار کریں، وہی وہ بالکل شاگرد بن کر قبول کر لینا، کارکنانِ تحریک کی اس شخصیت کو توڑ دے گا جو برسوں میں ایک خاص سانچے میں ڈھلی ہے۔ وہ پہلے تو دو پیمانے اور دوہرے کردار ادا کریں گے، ایک اصولی، دوسرے انتخابی - بعد میں وہ ہنگامہ آرائی و ہنگامہ پسندی کے سہل راستے کی طرف لڑھک جائیں گے۔ یہ واضح ہے کہ مروجہ انتخابی طور طریق اور ہمارے اصول و اخلاق میں کچھ قطعی فرق ہیں۔ یہ فرق پہلے ہماری شخصیتوں کو اور پھر جماعت کو دو حصوں میں بانٹ دیں گے۔ اس سلسلے میں انتہائی احتیاط ضروری ہے۔ فی الحقیقت جہاں کہیں ہمارا ٹھوس بنیادی دعوتی اور تنظیمی کام زیادہ ہوتا ہے، وہاں اسی کے تناسب سے انتخابات میں وقتی حامیوں کی تعداد بھی ووٹ دینے کے لیے اکٹھی ہو جاتی ہے اور جہاں کام نہ ہو، وہاں آپ ہزار تصویریں بنوائیں، فضول گیتوں کے کیسٹ بجوائیں، سخت تیکھے نعرے استعمال کریں، جھنڈے لہرائیں، کامیابی نہیں ہو سکتی - لہٰذا اصل زور اصل کام پر دینا چاہیے اور انتخابات کے انعقاد سے ۶ ماہ قبل وہاں کام کو انتخابی نہج

پڑ ڈال دینا چاہیے ، مگر قدم قدم پر خدا پرستانہ کردار کو مستقیم رکھ کر اور ذکر و نوافل کا اہتمام کرکے ، اور ہمیشہ یہ شعور تازہ کرتے ہوئے کہ ہم صرف ممنونانِ انتخاب نہیں ہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلابی شاہد و نقیب ہیں ۔ اور حضورؐ کے جادۂ سنّت سے انحراف نہیں کریں گے !

یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ دل سے یہ سمجھ لیں کہ اگرچہ مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت میں تغیر کی انتخابی راہ کے کھلے ہونے کی صورت میں اس کا استعمال ضروری ہے، لیکن اوّل تو موجودہ ماحول اور افرادِ معاشرہ کے احوال اور جمہوریت کے غلط تصورات کی وجہ سے ہمارے لیے ایمان و اخلاق کو باقی رکھ کر کوئی بڑی قوت حاصل کرنا تا دیر ممکن نہیں ہے، اور اپنی عددی کمزوری کی وجہ سے طرح طرح کی قوتوں سے مختلف انداز کے اتحاد قائم کرنے اور توڑتے رہنے سے بھی ہمارے تحریکی شعور و کردار کا نقصان ہوتا رہتا ہے اور اگر وزارتِ عظمیٰ اور اقتدار کی باگیں مروجہ دستور اور قواعد اور موجودہ بیوروکریسی کے ہوتے ہوئے مل بھی جائیں تو بھی ہماری مطلوبہ بھرپور تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی ، بلکہ "کمپرومائزز" کرنے ہوں گے اور قدم قدم پر وہی "بڑی برائی اور چھوٹی برائی" کا جھمیلا چلتا رہے گا جو انقلابی عزیمت کا قاتل ہے ۔ یہ ہم نہیں جانتے کہ مستقبل کی تاریخ ہماری مساعی کے آخری بڑے نتیجے ، یعنی اسلامی انقلاب کو کیا یک کدھر سے کونسا راستہ دے گی ، مگر یہ بہر حال یقینی ہے کہ ہماری موجودہ سیاسی ، انتخابی اور پارلیمانی مساعی اسی طرح تیاریِ انقلاب کا لازمی حصہ ہیں جیسے دوسرے مختلف شعبوں کے کام !۔ اور بھرپور انقلاب جب آئے گا تو ہم نہیں جانتے کہ وہ کس شکل میں اور کس راستے سے آئے گا۔

ایک بہت بڑا اور اہم کام تحریک نے اپنے اوائل میں ہمارے سپرد کیا تھا جس کا عنوان تھا "علمی امامت" (یا فکری قیادت) ۔ تصور یہ دلایا گیا تھا کہ جب تک کوئی جماعت یا تحریک یا قوم علمی امامت کی باگ ڈور نہیں سنبھال لیتی اس کا ایک وقتی حکومت بنا لینا کوئی اہم کارنامہ نہیں ہے ۔ اصل بڑی قوت علمی امامت کی ہے جس کی باگ ڈور الحاد پسند مغربی دانشوروں کے ہاتھ میں ہے ۔ اِس کے لیے تین سکیمیں مدِّنظر تھیں ۔

اولاً یہ کہ تحقیقی کام شروع کیا جائے اور مختلف شعبہ ہائے علوم میں ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کے ابطال کے ساتھ نئے خدا پرستانہ نظریات کی بنیادوں پر علوم اور تحقیقاتوں کو استوار کیا جائے ۔ افسوس کہ عرصۂ رفتہ کے لحاظ سے بہت ہی حقیر پیمانے پر کام ہو سکا ۔ مولینا مودودی جہاں تک مختلف نظریات و مباحث کو اسلامی بنیادوں پر استوار کر گئے تھے اور جتنا کچھ تنقیدی شعور وہ مغرب کے جدید علوم کے متعلق دے گئے تھے ، زیادہ تر اسی سرمائے کو کافی سمجھ کر کام چلایا گیا ۔

غنیمت کہ لندن میں اسلامک فاؤنڈیشن ، کراچی اور لاہور میں ادارہ ہائے معارف اسلامی ، اسلام آباد میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز ، پشاور میں ریجنل اسٹڈیز[1] کا قیام عمل میں آیا جن میں ایک تو عربی یا انگریزی کتب کے تراجم شائع ہوئے ، یا کچھ طبعزاد غیر تحقیقی چیزیں سامنے آئیں ، بہت تھوڑی سی کتابیں تحقیقی نوعیت کی پیش ہو سکیں ، ان میں سے بھی اول درجہ کی کتابیں چند ہی ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تک ہم نے فلسفہ و نفسیات ، تاریخ ، سوشیالوجی اور نظریۂ ارتقا جیسے مسائل پر اکا دکا معمولی مضامین کے سوا کوئی ایسا ٹھوس کام نہیں کیا کہ دنیا کا کوئی بھی شخص کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے اس سے بے نیاز ہو کر قابل اعتماد اور وقیع تحقیقی کام نہ کر سکے ۔ ایسی صدہا کتب اور ان سے متعلق منعقد ہونے والے سیمیناروں اور کانفرنسوں اور مباحثوں اور مساعئ خط و کتابت (ملکی اور بین الاقوامی دائروں میں) اور تنقیدی اور وضاحتی مقالات کی عالمی جرائد میں اشاعت کا ایک لمبا سلسلہ آہستہ آہستہ علمی امامت کا رخ ہماری طرف بدل سکتا ہے ۔

مگر اس کا کوئی خاص اہتمام اور کوئی خاص تفکر ہمارے ہاں کبھی نہیں پایا گیا ۔ لاہور کا ادارۂ معارف اسلامی قائم ہوا تو میری تجویز تھی کہ ہر شعبۂ کار میں علمی تحقیق کی تربیت و تیاری کے لئے دو دو ، تین تین

---

[1] رابطۂ عالم اسلامی اور دنیائے اسلام کی علمی کونسلوں نے بھی اچھا خاصا کام کیا ۔ غالباً رابطہ پیش پیش ہے ۔ علاوہ ازیں خالص دینی موضوعات (تفسیر ، حدیث ، فقہ اور سیرت) پر ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد ، اسلامی نظریاتی کونسل اور پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک اور بھارتی مسلمانوں کی اقلیت کے اداروں نے بھی خدمات انجام دی ہیں ۔ لیکن جو نظریات تہذیب الحاد کے ستون ہیں ۔ ان کے متعلق وقیع کام کا خلاء ہے ۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو مامور کیا جائے گا کہ نئی ٹیمیں تیار ہو کر کام کریں۔ مگر عملاً ہم کچھ نہیں کر سکے۔ نوجوانوں کو یہ ماحول یا تو دولت کی دوڑ میں لگا لیتا ہے یا وہ انتخابی لیڈری اور سیاسی عہدوں کی طرف لپکتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے کے خاموش اور خشک کام کو جو گوشۂ تنہائی میں خونِ دل جلا جلا کر انجام پاتے ہیں۔ اُن کے لیے اس مطالعہ گریز معاشرے میں، ٹھوس علمی خدمات کی انجام دہی کے لیے جس قسم کے درویشانِ خدامست چاہئیں وہ نایاب ہیں۔ بلکہ یونیورسٹیوں سے فارغ ہو کر نکلنے والوں کی اکثریت گہرے مطالعہ سے پورا پرہیز کر کے جعلی طریقوں سے امتحان پاس کرتی اور اپنی تعلیم یافتہ جہالت پر ڈگریوں کے سنہرے غلاف چڑھا لیتی ہے اور پھر ساری عمر اپنے آپ کو بھی اور دُنیا کو بھی یہ فریب دیتی رہتی ہے کہ ہم نے علوم و افکار کی بڑی اُونچی چوٹیاں سر کی ہیں۔

اِن ناگفتہ بہ حالات میں تحریکِ اسلامی کے متوسلین کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنی اولادوں، اپنے دوستوں اور رشتہ داروں، اور اپنے شاگردوں کے اندر سے محنت کر کے کچھ نوجوانوں کو ہر سال اُٹھاتے اور ان کے لیے وظائف کا انتظام بھی ہوتا۔ پھر وہ مختلف منصوبوں پر اداروں کے تحت اور پرائیویٹ تحقیقی کام کرتے۔ مگر ایک تو یہ سب کچھ ہوا ہی نہیں، دوسرے تحریک کے داخلی ماحول اور اس کی سرگرمیوں کے مطابق معیارِ پسندیدگی اور ترجیحاتِ رائجہ کے لحاظ سے مردانِ کار کی قدر و قیمت کا تعین کچھ اس طرح ہوتا رہا کہ سرے سے علمی و تحقیقی کام کی رغبت اور قدر پیدا نہ ہو سکی۔ رغبت صرف عہدوں کے لیے یا انتخابی اُمیدواری کے لیے ہے، یا پھر اسٹیج پر تقریری مہارت دکھانے کے لیے اور جلسوں جلوسوں اور مظاہروں اور نعرہ بازی کے لیے ہے۔ اندیشہ ہے کہ ایسی صورت میں ہماری مجالس میں، ہمارے داخلی انتخابات میں اور مجلسی اور سماجی اور محلہ داری کی زندگی میں "تعظیمِ ہنر" اور "تعظیمِ علم" کا بالکل قلع قمع ہی نہ ہو جائے۔ احتیاط!

اب انقلابِ امامتِ علمی کے سلسلے کی دوسری اسکیم کو لیجیے۔

اعلیٰ درجہ کی معیاری درس گاہ دیر تک ہمارا ایک اہم خواب بنی رہی۔ مگر وہ خواب آہستہ آہستہ بکھر گیا۔ اس کی ایک ہلکی سی، مگر اُمید افزا تعبیر منصورہ (حیدر آباد) میں نمودار ہوئی، مگر اس درس گاہ کو جس کی رُوحِ رواں پروفیسر سیّد محمد سلیم تھے، مارشل لا نے برباد کر دیا۔ اس کے بعد پھر آئندہ ایسے ہی کسی اندیشے کے پیشِ نظر اس رُخ پر کام بالکل بند ہو گیا۔ جیسے کوئی

خاندان کسی بچے کے شکارِ ظلم ہو جانے پر یہ فیصلہ کر لے کہ آئندہ کے لیے بچوں کی پرورش کا سلسلہ ہی ختم!

پھر اس سے نچلے درجے پر کوئٹہ، ملتان، اچھرہ اور دوسری جگہوں پر مروجہ نصابی نقشے پر کام کرنے والے ایسے اسکول نمودار ہوئے جن کا مقصد یہ تھا کہ اچھے استاد دورانِ نصاب اور اس کے متوازی کچھ ایسی چیزیں بھی سکھا دیں جو اسلامی ذہن بنانے والی ہوں اور ایسی عملی تربیت بھی دیتے رہیں جس سے کردار تعمیر ہوں۔ دوسری جگہوں کا مجھے علم نہیں مگر نیا مدرسہ اچھرہ کے بارے میں میں جانتا ہوں کہ قومیائے جانے سے پہلے کے دور میں اس نے ایسا معیار قائم کیا کہ محکمہ تعلیم کے بعض افسر کوشش کر کے اپنے بچے یہاں داخل کراتے تھے، نیز جو لوگ اس دور میں پڑھ کر نکلے وہ اب جہاں بھی کاروبار یا سرکاری ملازمتوں میں پائے جاتے ہیں ان میں نئے مدرسے کی ایک خاص روح دبی دبائی ملتی ہے۔

پھر ایک اسکیم تھی کہ کالجوں کے فارغ التحصیل نوجوانوں کو ایک سال یا دو سال ماہرین کی سرپرستی میں رکھ کر ان کے اندر دینی علم، عربی زبان اور تحریکی شعور اور ذوقِ تحقیق کی صلاحیتیں پیدا کر دی جائیں تاکہ وہ علمی تحقیق، تعلیم، علمی اداروں، پارلیمانی سیاست اور تحریکی قیادت کے لیے کارآمد بن سکیں۔ یا کم سے کم حکومت کے سول یا فوجی عہدوں پر جا کر بہ احتیاط اپنے مقصد کی خدمت کر سکیں۔ یہ کام اگر ہو جاتا تو اگر فقط ۲۰ افراد سالانہ بھی ایسے میدان میں لا سکتا جو تحریک کی اوّل درجے کی ضرورتوں کو پورا کر سکتے تو آج لادینیت پسند دانشوروں کا یوں زور نہ بندھا ہوتا۔

ایرک سپریان سے ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ تم حقیر سی تنخواہ پر اسلامیہ کالج میں پروفیسری کیوں کر رہے ہو (اس زمانہ میں محکمہ تعلیم کی تنخواہوں کا معیار کم تھا اور پرائیویٹ اداروں کا اور بھی کم) تو مارکسی ذہن کے اس فاضل استاد نے جواب دیا کہ میرے کام کا اتنا صلہ میرے لیے بہت ہے کہ میں ہر سال دو چار نوجوانوں کو ذہنی طور پر یہاں سے تیار کر کے معاشرے میں بھجواتا ہوں۔ یہ ہوتی ہے انقلابی اسپرٹ۔ ہم ایسے مقصد کے لیے کوئی اچھا ادارہ نہ چلا سکے، بلکہ جب ہم بالکل تھک ہار گئے تو مولانا گلزار احمد مظاہری مرحوم نے علماء اکیڈمی قائم کی جہاں عربی مدارس سے تعلیم یافتہ نوجوان اور سرکاری کالجوں کے طلباء کے گروپس ہر سال کچھ مدت کے لیے یکجا رہ کر دونوں طرز کے اساتذہ کی رہنمائی میں تبادلۂ علوم کرتے ہیں۔ مگر ہمارا معیارِ مطلوب قدرے بلند تھا۔

دوسری جانب دیکھیں تو ہونے والے کاموں میں سے ایک تو وہ سلسلۂ ادارات ہے، جو دُنیا کی دولت مند ترین برادری — اسماعیلیوں نے شروع کیا ہے۔ دوسری طرف حکیم محمد سعید بہت بڑا منصوبہ مدینۃ الحکمت کے عنوان سے شروع کر چکے ہیں، جس کی تفصیلات ہم سب کو جاننی چاہئیں اور اچھے سے اچھے لوگوں کو ایسی ملی خدمت میں حصّہ لینا چاہیے۔ تیسری طرف جناب طاہر القادری نے اچھے پیمانے اور قدرے جدید طرز کا دارالعلوم بھی شروع کیا ہے اور ساتھ ہی وہ ایک اعلیٰ درجے کے پبلک سکول کے قیام کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہم کسی فرقہ وارانہ تنگ نظری سے کام لیے بغیر کام کرنے والے کے کام کی داد دیتے ہیں۔ دوسرے اعلیٰ مقاصد کو چھوڑ کر آپ صرف ایک اسی بات کو لیجیے کہ اس پبلک اسکول سے نکلے ہوئے ۵۰ افراد سالانہ (بدرجۂ اقل) اگر اگلی منازل کو طے کر کے بڑھیں اور ان کی نصف تعداد سرکاری عہدوں پر قابض ہونے لگے تو چند سال بعد نتیجہ کیا ہوگا۔ دین کے لیے تو سب کی خدمات یکساں قابلِ قدر ہیں، مگر ایک خاص تحریکی اور انقلابی طرزِ فکر سے نوجوانوں کو آراستہ کرنے کا جو کام ہمارے ذمہ ہے، اُس کا کیا بنے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم دوسروں کے کام کے نتائج سامنے آنے کے بعد چونکیں اور ہاتھ پیر مار کر پھر کوئی کام کریں۔ مگر یہ پھر انقلابیوں والی بات تو نہ ہوئی، یہ تو وقت کی گاڑی آگے نکل جانے کے بعد اس کے پیچھے دوڑنا ہوا۔ پیچھے تو سبھی دوڑتے ہیں۔ سوال آگے نکلنے کا ہے۔ انقلابی قوّت تو نئے نئے راستے نکالتی اور نئے نئے ادارے قائم کرتی ہے جنہیں دیکھ کر دوسرے پیچھے پیچھے دوڑتے ہیں۔ یہ بھی ایک طرز کی امامت ہے کہ کوئی ادارہ یا جماعت یا تحریک آگے آگے رہے۔

منصورہ میں، اور باہر متعدد دارالعلوم ہمارے ہیں اور ان کی ضرورت و اہمیت اپنی جگہ ہے مگر یہ صرف ایسے افراد تیار کرتے ہیں، جو مخصوص دائروں میں ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں، بعض دوسرے دروازے ان پر بند ہیں۔ انجنیئر بننا، فوجی افسر ہونا، سول حلقوں میں کوئی مقام پانا، ان کاموں کے لیے ہمارے پاس کوئی تعلیمی ادارہ نہیں۔ اور نہ اُن کاموں کے لیے جن کا ذکر ہم نے شروع میں کیا ہے۔

سیّد مودودیؒ انسٹی ٹیوٹ بھی بڑا مبارک ادارہ ہے جو غیر ممالک کے بچوں کو خدمتِ اسلام کے لیے جدید خطوط پر ابتدائی مرحلے تک تیار کرتا ہے، مگر اس کے ہوتے ہوئے بھی وہ بڑا خلا باقی ہے جس کو

پُر کرنے کے لیے ایک تو معیاری درسگاہ (چاہے وہ کتنی ہی محدود ہو یا معدود طلبہ کو جمع کر سکے) کی اشد ضرورت ہے۔ دوسرے ایک پبلک سکول کی۔ بعد میں اس طرز پر جا بجا کام کیے جا سکتے ہیں۔

ہمارے سامنے دیوبند اور سرسید کالج اور ندوہ کی مثالیں پہلے سے ہیں، حال ہی میں میری توجہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے کام اور اثرات کی طرف منتقل ہوئی۔ بہت سے ایسے نوجوانوں کو میں جانتا ہوں جو مولانا حمید الدین فراہیؒ کے تفسیری مدرسۂ فکر کے نہایت پکے مرید و مقلد ہیں اور جہاں کہیں ہیں وہ علامہ فراہیؒ کا جھنڈا بلند کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی تفسیر سورۂ فیل کے سلسلۂ بحث میں نہایت ہی محترم بزرگ دوست مولانا صدر الدین اصلاحی کا ذکر ترجمان القرآن میں آ چکا ہے۔ شرف الدین اصلاحی کا کام بھی میرے سامنے ہے، دوسرے نوجوان جو لاہور میں فکرِ فراہی کی مشعل کو بلند کر رہے ہیں، ان کی سرگرمی بھی معلوم ہے۔ رہے بڑے حضرت مولانا اصلاحی، سو وہ تو ہم جیسوں کی حدِ نگاہ سے بھی آگے مقیم ہیں۔ لیکن اِدھر مجھے ایک مضمون نے بہت چونکا دیا۔ معارف میں ایک مضمون ستمبر ۸۸ء میں چھپا تھا۔ "علامہ شبلی کی تنقید نگاری (تصحیح و استدراک)" اس میں مطابق بحث ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب (" مریخ " پٹنہ، بھارت بابت ماہ ستمبر تا دسمبر ۸۸ء) علامہ شبلیؒ کی پگڑی اُتار کر علامہ فراہیؒ کے سر باندھ دی گئی ہے۔ (اس کے محتاج فراہی نہیں ہیں)۔ یہ مضمون ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی (مدینہ منورہ) نے لکھا اور اس کا جواب قاعدے کے مطابق معارف ہی کو بھیجا گیا، مگر وہاں چونکہ ادارت مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے پاس ہے، لہٰذا باوجود اصرار کے اس کی اشاعت میں لیت و لعل سے کام لیا گیا، لہٰذا مجبوراً اسے مریخ میں شائع کیا گیا۔

مَیں اس بحث میں نہیں جاتا کہ کونسا فریق حق پر ہے، کس پر الزام غلط ہے۔ میں تو صرف یہ توجہ دلا رہا ہوں کہ ایک درس گاہ کے پُرسکون کام کے نتیجے میں کس طرح صرف " اصلاحیت " اور " فراہیت " کا ایک فکری نظام زنجیری حلقوں کی طرح مختلف اداروں کے ذریعے اطراف میں آہستہ آہستہ کونپلیں نکال رہا ہے۔ یہ فکر کسی انقلاب کی محرک نہیں، مگر عالمِ افکار میں اور خصوصاً دینی مباحث میں اس کا بھی ایک اثر ہے جو تھوڑا بہت بڑھ بھی سکتا ہے اور کسی جگہ جا کر رُک بھی سکتا ہے، جیسے کہ مفسرین و محدثین کے مختلف نقطہ ہائے نظر ایک دور میں اُبھرے

اور پھر تہ نشین ہو گئے۔ خیر بحث اس سے نہیں۔ بحث اس سے ہے کہ اگر کسی انقلابی و تحریکی فکر کے ساتھ ہم لوگ اپنی درس گاہ قائم کر سکتے تو خواہ وہ کتنے ہی محدود پیمانے پر چلتی مگر ۲۰، ۳۰ سال کے عرصے میں وہ اپنے سینکڑوں فکری مشعل بردار معاشرے میں پھیلا سکتی۔

میرا خیال ہے کہ اب بھی وقت ہے کہ لادینیت کے خلاف ہمیں مضبوط تعلیمی محاذ ضرور قائم کرنا چاہیئے۔ اس موضوع پر اگر اپنے ہاں سے صرف تعلیمی ماہرین کا کوئی بورڈ یا کمیشن بٹھایا جائے کہ وہ انتظامی عہدہ داروں کے ذہنی دباؤ سے آزاد ہو کر ایسے کسی قابلِ عمل منصوبے (یا متعدد مختلف اسکیموں) کا نقشہ تیار کر دے تو پھر انتظامی قوتیں اس کو افرادی اور مالی وسائل کے لحاظ سے مناسب تدریج کے ساتھ چلا سکتی ہیں۔

وقت ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے اپنی ذمہ داریوں کا حساب چکا دینا چاہیئے۔[۱]

یہاں فی الحال میں اس طویل سلسلۂ بحث کو ختم کر رہا ہوں جو تین چار ماہ کے اشارات پر محیط ہو گیا ہے۔ اب آگے کچھ ایسے موضوع باقی ہیں جن کی طرف رُخ کرتے ہوئے پَر جلتے ہیں۔ لہٰذا کہنے کی کوئی اور بات نہیں ہے۔

---

[۱] بحث اس سے نہیں کہ کب کیا فیصلہ ہوا اور کب کس طرح کا مشورہ ہوا یا مؤسسِ تحریک بھی اس کام کے تاخیر و التوا یا اس کے ترک کے ذمہ دار ہیں یا نہیں۔ نہ یہ باتیں کسی بھی دور کے کسی بھی ذمہ دار اصحاب پر کوئی ذمہ داری ڈالنے کے لیئے ہیں۔ بات تو صرف اتنی ہے کہ تحریک کے تقاضوں کے لحاظ سے ایک کام اشد ضروری تھا، اس میں تشکیل پاکستان کے سلسلے میں جو مصائب قوم کو پیش آئے وہ حائل ہوئے، پھر دستوری جد و جہد حائل ہوئی، پھر انتخابات حائل ہوئے اور ہمارے اندر یہ غلط تصور بھی ابھرا کہ شاید دو تین انتخابات کے بعد نظام میں اتنی تبدیلی آجائے کہ سرکاری یونیورسٹیوں کا ہی تعلیمی نقشہ بدل جائے۔ اور پھر ایک مارشل لا اور دوسرا اور تیسرا اور بیچ میں مارشل لا سے بھی سخت تر جمہوری فسطائیت۔ مگر ان سارے احوال کے باوجود تحریک کی ضرورتِ تعلیم گاہ ہم سے اپنی تکمیل کا تقاضا کر رہی ہے۔